

۱۱۹۳ء میں دہلی کی فتح کے بعد دہلی اور اس کے گرد و نواح میں باہر سے آئے ہوئے مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہوئے۔ یہ نو وارد لوگ فارسی زبان بولتے تھے لیکن علاقہ کے قدیم باشندوں سے ربط قائم کرنے کے سلسلے میں مقامی بولی کو سیکھنا ضروری تھا تاکہ مفتوحہ لوگوں سے گفت و شنید کے ذریعہ سلطنت کے نظم و نسق میں مدد مل سکے۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں برج بھاشا کا اثر تھا۔ جب مسلمانوں نے اس کو بولنا شروع کیا تو اس میں فارسی اور عربی الفاظ شامل ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی بولی کی شروعات ہوئی اس کو بھی مسلمانوں نے ہندوی کا ہی نام دیا۔ صوفیاء کرام نے نو مسلم مریدوں کی تربیت اور آسانی کے لیے اپنی خانقاہوں میں اس کو اپنایا۔ غرض کہ سو سال کے اندر ہی یہ بولی مقبول ہو گئی اور عوام کی طرح خواص بھی اسے بولنے لگے۔ اگرچہ مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی زبان فارسی ہی رہی۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز پر حیدرآبادی سلطنت کی توسیع گجرات اور دکن میں ہوئی تو دہلی کی فوجوں اور انتظام حکومت سے متعلق لوگوں کے ساتھ دہلی میں جانے والی ہندی بھی ان علاقوں میں پہنچی۔ اس توسیع کے ساتھ ساتھ دہلی سے وہاں جانے والے مسلمانوں

سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان وہاں بہت پہلے سے رہ رہے تھے۔ عونی کے گجرات پہنچنے سے بہت پہلے پارسوں کے درغلانے پر مقامی ہندوں نے کھنایت میں مسلم آبادی پر حملہ کر کے انھی مسلمانوں کو شہید کر دیا اور ان کی شاندار مسجد اور اس کے مینارہ کو منہدم کر دیا۔ اس پر مسلمانوں کے خطیب نے جن کا نام علی تھا کھنایت سے راجدھانی انہلوڑہ کا سفر کیا اور وہاں پر راجہ کو ایک قصیدہ کے ذریعہ جو کہ راجہ کی زبان ہی گوجری یا گجراتی ہے تھا پڑھ کر اس کی اطلاع دی۔ راجہ نے ذالی طور پر کھنایت، جاگر واقعہ کی تفتیش کی چرموں کو موت کی سزا دی اور مسجد کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے رقم دی۔ عونی نے خطیب کے قصیدہ کی زبان کو گوجری کے بجائے ہندوی بتایا ہے۔ بابا فرید الدین گنج شکر کی پنجابی شاعری کا بھی عہد وسطیٰ کے مورخین ہندی شاعری کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح امیر خسرو دہلیا چرچۃ الکمال میں سعد مسلمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے فارسی کے علاوہ ہندوی میں بھی اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔

سید الدین محمد عونی، جوامع الحکایات و نواع الروایات مرتبہ محمد نظام الدین حیدر آباد ۱۹۹۴ء ۲/ ۲۵۵

سلہ راقم الحروف کی کتاب *Islam and Muslims in South Asia: Historical Perspective* Delhi 1984 P. 1987, Delhi 1984 P. 71

کی آبادی بڑھتی رہی۔ مذہبی رہبری اور تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے وہاں علماء اور مشائخ بھی پہنچے۔ سلطان محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دہلی کی پوری مسلم آبادی جو کئی لاکھ پر مشتمل تھی، دکن میں دولت آباد منتقل کر دی۔ سلطان کا مقصد دہلی کی طرح دکن کو بھی مسلم تہذیب کا مرکز بنانا تھا تاکہ اس کی وجہ سے وہاں اس کی حکومت مستحکم ہو سکے۔ اس حکمت عملی کا ہندوی کے حق میں خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا۔ کیونکہ دہلی کے قدیم باشندوں نے دکن میں اپنی ہندوی کو محفوظ رکھا حالانکہ ان کے علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں وہ قدیم مراٹھی، تیلگو اور کنڑ زبانیں تھیں جو کہ شمالی ہند کی بولیوں سے بالکل مختلف تھیں اسی طرح گجرات میں بھی دہلی کی ہندوی محفوظ رہی وہاں مسلمان گوجری کی بجائے اپنے گھروں میں ہندوی بولتے رہے۔ دکن میں بولی جانے والی ہندوی جس کو کئی اردو کہتے ہیں اور گجرات کی قدیم ہندوی کے نمونے اردو زبان کی تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے اردو کی نشوونما پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل کی سطور میں دہلی میں بولی جانے والی ہندوی کے جس کو ابو الفضل نے دہلوی کے نام سے موسوم کیا ہے اور جو انیسویں صدی میں اردو کہلائی ارتقا کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اگرچہ امیر خسرو کے دیباچہ عزتہ الکمال میں ہندوی شاعری کے رواج کا ذکر کیا ہے اور اس سے فارسی بولنے والے مسلم رانوں میں اس کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے لیکن ہندو کے الفاظ اور جملے چودھویں صدی عیسوی کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان الفاظ اور جملوں کی اہمیت اس لیے ہے کہ ہندوی کی تاریخ مرتب کرنے میں ان سے مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں شعراء کے دواوین کے علاوہ ہندوستان میں لکھے گئے صوفیاء کرام کے ملفوظات اور فارسی کی لغات بہت اہم ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات نصیر الجالس، میں ہندوی الفاظ اور جملے ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ نے مریدوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ سودا گروں کے گھر کے دو حصے ہوتے ہیں ایک اندرونی یعنی زانخانہ اور دوسرا باہری جو کہ دوکان کا کام دیتا ہے کیونکہ اس میں خرید و فروخت سے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ ایک دن زانخانہ سے باہری حصہ میں کثیر آئی اور کہا ”خواجہ طعام رسیدہ است (کھانا آ رہا ہے)“، نہاری بیارم“ سودا گرنے ہندوی میں کہا ”رہ رہ“ (یعنی پٹھرو)۔ اسی طرح

ایک دن مریدوں کو بتایا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ایک بت پرست تھا جو کہ وہاں نہ عشق کے ساتھ اپنے بت کی پرستش کرتا رہا۔ ایک دن وہ شدید بخار میں مبتلا ہو گیا۔ بخار کی پیش سے آرام پانے کے لیے اُس نے بت سے رجوع کیا یہ کہتے ہوئے "تو میرا گسامیں توں میرا کرتا رہ مجھ اُس تاپ تھین چھڑا" جب بت سے کوئی جواب نہیں ملا اور بخار کی پیش میں اضافہ ہونے لگا تو اس نے بت کو ٹھوکر مار کر پھینک دیا اور کہا "تو کرتا نہیں"۔

شیخ نظام الدین اولیاء کی بدایوں میں دستارِ فضیلت کی رسم کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے ہیں کہ دستارِ فضیلت باندھنے کی رسم کے سلسلے میں دعوت کا انتظام کیا جاتا تھا اور اس میں عمائدین شہر کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بدایوں میں تقویٰ اور روحانی صلاحیت کی بنا پر نو مسلم درویش سنی علی مولا کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ علی مولانا ہندو خُراد ہونے کی وجہ سے فارسی سے نا بلند تھے اور مقامی زبان بولتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے استاد مولانا علاء الدین اصولی نے ان کو بہانہ خصوصی کی حیثیت سے بلایا اور شیخ کے سر پر دستار باندھنے کے لیے بھی انھیں سے درخواست کی جب وہ دستار باندھ رہے تھے تو اچانک مولانا سے پکار کر کہا "مولانا یہ بڑا ہوسی۔ یعنی ای مولانا میں مرد بزرگ خواہ شد" مولانا نے علی مولا سے پوچھا کہ "آپ کیسے کہتے ہیں؟ جواب دیا "چومنڈا سا باندھی سو پائیں پسری۔ یعنی اُن کہ دستار بر سر بندد او دریا می کسی افتد" اور پھر مزید کہا "کہ درد ستار او ایریشم نیست، دستار سادہ است، این بزرگ خواہ شد"۔

سہ ایضاً ص ۱۲۳

سہ شیخ علی مولا کا ذکر شیخ نظام الدین اولیاء کی ملفوظات فوائد الفواد میں بھی ملتا ہے لیکن شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے زیادہ تفصیل فراہم کی ہے۔ ابتدا میں علی مولا ڈاکو تھے۔ ایک دن انھوں نے بدایوں میں شیخ جلال الدین تبریزی کو دیکھا جب شیخ کی نظر اُن پر پڑی تو وہ شیخ کے قدموں پر گر پڑے۔ اُن کے ساتھ رہنے لگے۔ مسلمان ہو کر ریاضت اور مجاہدہ میں مہروف ہو گئے۔ جب شیخ جلال الدین تبریزی نے بدایوں سے بنگال کے لیے ہجرت کی تو علی مولا کو اپنے جانشین کی حیثیت سے بدایوں میں قیام کا حکم دیا۔

حمید قلندر، خیر الجالس، مرتبہ غلیق احمد نظامی، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۱

۳ ص ۱۹۲۔ سہ ایضاً ص ۱۹۱

شیخ نظام الدین اولیاء کے ہم عصر ایک عالم کے بارے میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری فرماتے تھے کہ مولانا علاء الدین دہلی میں رہتے تھے وہ تفسیر، حدیث، فقہ، نجوم، منطق وغیرہ کا درس دیتے تھے۔ جب شہر کے علماء اور مشائخ کو دربار شاہی میں مدعو کیا جاتا تھا تو مُنادی ہوتی تھی۔ وہ اطلاع پا کر یہ کہہ کر جانے سے منع کر دیا کرتے تھے جو ہو سو ہو۔^۱

شیخ نظام الدین کے دوسرے خلیفہ شیخ برہان الدین غزنی اپنے پیر کی ہدایت پر دعوت و تبلیغ کے لیے دہلی سے دولت آباد (دکن) جا کر مقیم ہوئے۔ وہ دولت آباد میں مریدوں سے ہندی ہی میں گفتگو کرتے تھے جیسا کہ اُن کی ملفوظات احسن الاقوال سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے ہندوی الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے کھٹ (چارپائی) کچھری ڈولہ چھڑا، اس کے علاوہ ایک ہندوی دوہا بھی ملتا ہے۔^۲

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کے رول پر بڑی دیدہ ریزی سے تحقیق کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ”دیوبی کو ہاتھ میں لانے کے لیے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ دُرُوش کا تکیہ (یعنی خانقاہ) سب کے لیے کھلا تھا۔ بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ اُن کے پاس آتے اور اُن کی زیارت اور صحت کو موجب برکت سمجھتے عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام اُن کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین کے لیے انھوں نے جہاں اور ہنگ اختیار کیے اُن میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔^۳

یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شیخ برہان الدین غزنی یا سید محمد کیسودرا زیادہ دوسرے صوفیاء جو دہلی سے دکن اور گجرات گئے وہ اپنی زبان یعنی دہلی کی ہندی لے کر گئے تھے اور اپنی خانقاہ میں آنے والوں سے فارسی یا ہندی میں

^۱ ملہ زین بدرعبی، خوان پر نصرت، پٹنہ، ۱۳۲۱ء ص ۱۱۱

^۲ ملہ حاد بن عماد کاشانی، احسن الاقوال، مخطوطہ، یونیورسٹی کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ فارسیہ مذہب تصوف نمبر ۳۱۸۔

^۳ ملہ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام بطور مددگارین پیرس دہلی۔

گفتگو کرتے تھے۔ دونوں علاقوں میں ہندوی مسلمانوں کی زبان تھی۔ دوسرے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صوفیاء عیسائی مبلغین کی طرح کام نہیں کرتے تھے۔ یعنی وہ غیر مسلموں تک پہنچ کر انہیں دعوتِ اسلام نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی خانقاہوں میں رہتے تھے اور مسلمانوں میں خریدی کے ذریعہ دینداری کا جذبہ پیدا کرنا ان کا مقصد ہوتا تھا۔ اگر کوئی غیر مسلم ان کے پاس آتا تھا تو اس کے ساتھ بہت محبت اور مہر رمدی سے پیش آتے تھے۔ ایسے ہندؤں میں سے کچھ کا شیخ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنا بعد از قیاس نہیں ہے لیکن کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ وہی سے گئے ہونے کسی صوفی نے گو جری، تیلگو، کنڑ یا مراٹھی سیکھی ہو۔

شیخ برہان الدین غریب کے بعد دوسرے اہم صوفی بزرگ جو دہلی سے ہجرت کر کے دکن میں جا کر گلبرگہ میں مقیم ہوئے وہ سید محمد حسینی گیسو دراز تھے۔ ان کی بول چال کی زبان بھی ہندوی تھی اور اسی میں وہ گفتگو کرتے تھے جو ام الکلم ان کے ملفوظات کا مشہور مجموعہ ہے۔ احسن الاقوال کی طرح اس میں بھی ہندوی الفاظ ملتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ شیخ کی مجلس میں ایک دن ایک ہندو طبیب مسیٰ بھٹو مولانا جمال الدین سے ملاقات کرنے کی نفل سے آئے۔ گفتگو کے دوران مولانا ناصر الدین نے ہندو طبیب کو "ابے بھٹو" کہہ کر مخاطب کیا۔ اس پر مولانا جمال الدین ناراض ہو کر بولے "ابے کیا ہوتا ہے" ان کو تمہیں "برادر بھٹو" کہہ کر مخاطب کرنا چاہیے تھا۔

اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ مرتب کرنے کے سلسلے میں چودھویں صدی سے ہندوستان میں لکھی ہوئی فارسی لغات کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔ ان لغات میں قدیم اور مشکل فارسی الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بیان کرتے ہوئے مؤلفین نے ہندوستانی قارئین کی سہولت کے لیے فارسی الفاظ کے ساتھ ان کے ہم معنی ہندوی الفاظ بھی دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں فارسی کی ایسی اصطلاحات بھی ملتی ہیں جن کو نظم و نسق کے سلسلے میں مسلمانوں نے ہندوستان میں اختراع کیا تھا۔ یہ اصطلاحات ہندوستان سے باہر کے فارسی لٹریچر میں بالکل نہیں ملتیں لیکن اردو میں آکر زبان زد ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر زمیندار۔

ہندوستان میں لکھی گئی لغات میں سب سے قدیم لغت "فرہنگ تو اس" دستیاب

ہوئی ہے۔ یہ فرہنگ تو اس سلطان علاؤ الدین خلجی کے عہد (۱۲۹۳ء تا ۱۳۱۲ء) میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مؤلف مولانا فرید الدین مبارک شاہ تو اس غزنوی تھے۔ مولف کے نام ہی سے اس کو فرہنگ تو اس کہا گیا ہے۔ اس میں قدیم فارسی الفاظ کے مترادفات کے طور پر ہندوی الفاظ ”پنکھا“ کھیل، پھیر، گالہ، لڈو وغیرہ ملتے ہیں۔ کیا رنگ کا فارسی زبان میں مطلب بیان کرتے ہوئے صاحب لغت لکھتے ہیں کہ فارسی میں کیا رنگ کے معنی ہر زبان اور شجہ و ولایت کے ہیں لیکن ہندوستان میں کیا رنگ کا مقابل زمیندار ہے۔ یعنی وسط ایشیا اور ایران میں کیا رنگ، شجہ وغیرہ اُس رئیس کو کہتے تھے جو کہ ایک بڑے علاقے کا مالک اور حکمراں ہوتا تھا اور یہ اس کو وراثت میں ملتا تھا۔ اسی طرح دہقان کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دہقان گاؤں کا وہ فرد ہے جن کو حکومت گاؤں کے بند و بست اور لگان کی وصولیابی میں مدد دینے کے لیے مقرر کرتی ہے۔ ہندوستان میں دہقان کو خوب کہتے ہیں۔

فرہنگ تو اس کے بعد سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں حاجب خیرات معروف دہلوی نے دستور الافاضل مرتب کی۔ دستور الافاضل میں ہندوی کے الفاظ زیادہ ملتے ہیں۔ اس میں اذہب کے ہندوی معنی مکھی دئے ہیں۔ بدل کے معنی گیاہ، تخ بتاتے ہوئے اس کا ہندوی مترادف لگردندہ دیا ہے۔ کھٹ کا ترجمہ چارپائی سے کیا ہے۔ مسک کے معنی میں ”گوکھڑ“ دیا ہے۔ ام غیلان کے معنی میں اس کا ہندوی مقابل ”کیکر“ دیا ہے، بلاد کے معنی ”بھلا نواں“ بتانے گئے ہیں۔

۱۔ فرہنگ تو اس۔ مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد۔ بنیاد فرہنگ ایران، طہران، ۱۹۴۳ء
۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا انگریزی مقالہ

*Historical Significance of the Fourteenth
Century Farhang Literature of the Delhi
Saltanate Period, Indo-Iranica, Calcutta
Vol. 32, nos. 3-4, September-December, 1979, pp. 9-21*

۳۔ حاجب خیرات دہلوی معروف۔ دستور الافاضل، مرتبہ نذیر احمد، بنیاد فرہنگ ایران، طہران، ۱۹۴۳ء، صفحہ ۶۴، وغیرہ۔

پندرہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی فرہنگوں میں ہندوی الفاظ زیادہ کثرت سے استعمال ہونے لگے تھے۔ اس عہد کی فرہنگوں میں محمد بن تفلح بن رستم کی تالیف "بحر الفضائل" بدرہلوی کی "ادارۃ الفضائل" بدرابراہیم کی "زفان گويا" اور محمود بن ضیاء کی "تحفة السعادة" غالب طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے اردو الفاظ کے املا کا مطالعہ بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔

پندرہویں صدی کے ہندوستانی فارسی لٹریچر کے مطالعہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ عوام کی طرح مسلم خواص بھی گھروں میں ہندوی بولنے لگے تھے۔ عربی مذہبی اور فارسی ادبی زبان ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۳۹۸ء میں دہلی اور مغربی یوپی تیمور کے حملہ کی وجہ سے بڑی طرح تاراج ہو گئے تھے اور دہلی کے دانشور ہجرت کر کے جونپور، مانڈو (مالوہ) احمد آباد گجرات اور گنگر (یعنی دکن) میں آباد ہو گئے تھے۔ ان مہاجرین کے ساتھ ہندوی یا قدیم اردو بولنے والوں کی مختلف علاقوں میں تعداد خاطر خواہ بڑھی۔ اسی وجہ سے اردو کی نشوونما کا مطالعہ کرنے میں گجرات اور دکن کے صوفیاء کے ملفوظات کے مجموعے بہت معاون ہیں۔

برخلاف گجرات اور دکن کے مسلم اشراف نے پوربی علاقہ میں جس سے ہماری مراد موجودہ زمانہ کے اُن اضلاع سے ہے جو کہ مشرقی یوپی میں شامل کیے جاتے ہیں اور جن کے نظم و نسق کے سلسلے میں کڑھ، اودھ اور بنارس شہروں کو صوبائی مراکز بنایا گیا تھا اپنی دہلی کی ہندوی کو چھوڑ کر اظہار خیال کے لیے وہاں کی مقامی بولی (Dialect) اودھی کو اپنالیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں ان علاقوں میں دہلی سے گئے ہوئے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو سکی اور ہندوؤں میں اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کا کام بھی زیادہ پیمانہ پر نہیں ہوا۔ دوسرے اودھی اور دہلی کی ہندوی میں جو کہ برج بولی سے متاثر تھی بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے جننا فرق گجرات میں گجراتی دکن میں تیلگو اور کڑھی اور مراٹھی میں ہے۔ لہذا چودھویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں سے مسلم صوفیاء نے اودھی میں مثنویاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ اس عہد کی مشہور مثنوی مٹا داؤد کی چندائون

سلسلہ فرہنگ زفان گويا کو ڈاکٹر نذیر احمد نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ ابھی جلد اول غدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع ہوئی ہے سن طباعت ۱۹۸۹ء ہے۔ لیکن دوسری لغات ہندوستان اور انگریزی لائبریریوں میں ملوثا کی شکل میں ملتی ہیں۔

ہے۔ اس میں لورک اور چندا کے عشق کی داستان کو نظم کیا گیا ہے۔ کیونکہ اشعار عشق مجازی کی تاثیر اور روحانی زندگی میں اس کی اہمیت کی تائید کرتے ہیں اس لیے یہ مثنوی صوفیاء میں بہت مقبول ہوگئی۔ کچھ غیر صوفی عالم بھی جو تصوف سے متاثر تھے وہ اپنے وعظ کے دوران اس کے اشعار پڑھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق اُن کے عہد یعنی سولہویں صدی عیسوی میں واعظ اور علماء اپنی تذکیر اور وعظ کو موثر بنانے کے لیے چند اُن کے اشعار بوقوعہ بموقعہ سنانے لگے۔ مخدوم شیخ تقی الدین ربانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ جمعہ کے دن منبر سے وعظ کے دوران چند اُن کے اشعار پڑھتے تھے۔ اسی طرح بعد میں لکھی ہوئی مشہور مثنویان ”پداوت اور مد و مالتی جن کو شیر شاہ سورا اور اسلام شاہ سور کے عہد میں ملک محمد جالسی اور میر سید منجن نے لکھا تھا اور دہلی زبان ہی میں ہیں۔ ان کے لکھنے میں بھی دونوں شاعروں کے ہاں عشق مجازی کی صداقت کا تصور کارفرما نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا مثنویوں کو اردو والوں کی بجائے ہندی والوں نے اپنایا اور ان کو فارسی رسم الخط سے بدل کر دیوناگری رسم الخط میں چھپوایا ہے۔ حالانکہ ان میں کثرت سے عربی اور فارسی الفاظ ملتے ہیں علاوہ ازیں ان کی ترتیب فارسی مثنوی کے انداز پر ہے۔ ہر مثنوی حمد سے شروع ہوتی ہے۔ حمد کے بعد نعت شریف اور منقبت ہے۔ پھر شاعر اپنے پیر اور بادشاہ وقت کی تعریف میں اشعار لکھتا ہے۔ مثلاً ملک محمد جالسی پداوت میں شیر شاہ سور کی عظمت، اس کے تلوار چلانے کی صلاحیت، اس کی عقل سلیم، اُس کی زبردست فوج و اُس کے غیر جانبدارانہ عدل کے بارے میں رطب اللسان ہے۔ وہ شیر شاہ کو عدل کے معاملے میں حضرت عمر فاروقؓ کا پیر و بتاتا ہے۔ یہ شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ شیر شاہ کے ہم عصر اور اکبر کے عہد کے مورخین بھی اس سلسلے میں جالسی کے ہمنوا ہیں۔ میر سید منجن کی مد و مالتی میں بھی حمد، نعت اور منقبت کے بعد شاعر کے پیر اور بادشاہ وقت اسلام شاہ بن شیر شاہ سور کی مدح کی گئی ہے۔

دہلی جو کہ سلطنت کا دار الخلافہ تھا اور جہاں پر مسلم ثقافت ۱۳ ویں صدی سے ترقی

۱۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، مبداء اول۔ صفحہ ۲۵

۲۔ مدھو مالتی۔ مرتبہ ڈاکٹر طاہر شاہ دیکھتا۔ الہ آباد، ۱۹۶۱ء

کر کے چودھویں صدی کے اوائل میں اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گئی تھی اس کو اور اس کے قریب مغربی یورپی کے علاقہ کو ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس تباہی کا اثر دہلی اور مغربی یورپی پر پچاس سال تک رہا۔ دہلی ویران ہی رہا۔ لیکن پندرہویں صدی کے نصف اول کے خاتمہ کے بعد ۱۵۱۷ء میں بہلول لودی کا دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے سے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ کی معاشی اور ثقافتی ترقی کے لیے دوبارہ حالات سازگار ہوئے۔ رفتہ رفتہ دہلی نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنی شروع کر دی۔ بہلول کے بیٹے سلطان سکندر لودی کا عہد (۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۷ء) کو علم و ادب کے فروغ کے لیے عہد زریں تصور کیا جانا چاہیے۔ سلطان کی علم دوستی کی شہرت سے ہندوستان اور بیرونی ممالک سے علماء و فضلا اور اہل دانش و ادب ہجرت کر کے دہلی اور آگرہ میں بس گئے اور ان کی موجودگی نے ان شہروں کو علم و فضل کے مراکز میں تبدیل کر دیا۔ سلطان نے فارسی طبیعت کے علاوہ ہندوی کے شعراء کی بھی سربستی کی۔ ایسی خوشگوار فضا میں ہندوی شاعری کی مزید ترقی یقینی تھی۔ شاعروں نے اپنی شہرت کے لیے نعتیہ کلام جو کہ بہت مقبول ہو گیا تھا ہندوی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ سلطان سکندر لودی کے ندیم اور عظیم شاعر جمالی گنبو کے متعلق بتا ہے کہ ان کی نعت جس کا شعر ہے:-

موسیٰ زہوش رفت بیک پر توصفات

توعین ذات می نگر می در تبسمی

مقبول عام ہو گئی تھی۔ اس کو مزید مقبول بنانے کے لیے جمالی نے اس کا ہندوی میں ترجمہ خود ہی کیا تاکہ قوال محفل سماع میں گاسکیں۔ عبدالقادر بدایونی کے زمانہ میں یہ ہندوی ترجمہ قوالوں کے ذریعہ دہلی اور آگرہ میں مقبول عام ہو گیا تھا۔

لودی سلطانین کے عہد کے فارسی لطیفہ پر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کے مصنفین نے اپنے خیالات کا ہندوی سے فارسی میں ترجمہ کر کے لکھا ہے۔ ان کتابوں میں ہندوی الفاظ کی بھرمار ہے۔ جیسا کہ شیخ رزق اللہ

مشتاقی کی تالیف ”واقعات مشتاقی“ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں بہت سی وہ اصطلاحات بھی ملتی ہیں جو کہ فارسی یا عربی لفظ میں معمولی سی تبدیلی کر کے بنائی گئی تھیں اور وہ مسلمانوں میں روزمرہ کے طور پر استعمال ہونے لگی تھیں۔ مثلاً جمہ کے دن مسلمان نماز کے بعد مسجد سے گھر واپسی پر فقراہ میں روپیہ بانٹتے تھے اس کو جمعگی کہتے تھے۔ دوسرے برج کی شاعری کے اثر سے ہندوی میں ایک نئی صنف سخن کا آغاز ہوا اور اس کا اصل نام کھڑک یا کھڑکا ہی رہا یہ چند مصرعوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی امرا، اور روسا کی شان میں کھڑکا لکھ کر سنانے لگے۔ اس ضمن میں مشتاقی سلطان سکندر کے ایک امیر کا ذکر کرتے ہیں جو کہ سلطان کا معتقد ندیم بھی تھا۔ ایک دن ایک شاعر نے اس کی شان میں کھڑکا لکھ کر پڑھا۔ تو اس نے اس کو بڑا قیمتی گھوڑا جس پر سوار تھا انعام میں دے دیا۔

اسی عہد میں ایک دوسری صنف سخن کے رواج کا ثبوت ملتا ہے جو کہ ریختہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں بعد میں غزل بھی کہی جانے لگی۔ لیکن پندرہویں صدی کے شعراء کے ہاں ایسے منفرد اشعار ملتے ہیں جن کا ایک مصرعہ فارسی میں اور دوسرا ہندوی میں ہے۔ اس کی مقبولیت اتنی تھی کہ باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی متاثر ہونے اور انھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ کیونکہ بابر کی مادری زبان ترکی تھی لہذا جب اس نے ریختہ میں شعر کہا تو ایک مصرعہ ہندوی کا دوسرا ترکی کا تھا۔ بابر نامہ میں یہ شعر ملتا ہے۔

جبکانہ ہوا کچھ ہوس مانک و ہوتی
فقراہلیقہ بس بولنو سید دریانی ورنی

اسی صنف میں لودی سلاطین اور بابر کے ہم عصر صوفی شاعر شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا شعر ہے:

صدق رہبر، صبر توشہ، دوست منزل، دل رفیق
ست نگر، دھرم راجہ، جوگ دیوگ، مارگ نڈا

عشق مجازی کے جواز کا ثبوت شریعت سے فراہم نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ

سہ واقعات مشتاقی۔ مخطوطہ برٹش لائبریری۔ لندن۔ ورق ۶۷ الف

سہ شیخ رکن الدین۔ رشد نامہ۔ جھج ۱۳۱۴ھ ص ۱۵
۱۶۲

اس دور کی شاعری اور تصوف میں بعض اوقات عشق مجازی کا تصور بہت اہم ہوا ملتا ہے۔ ریختہ کا سب سے اچھا شعر بیرم خاں کا ملتا ہے:

صد بار بگفتم کہ نکرانی (یعنی ٹھکانی) حیو
یکبار نکفتی کہ پیا پانی پتو

اس شعر کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں دلچسپ تلویح بیان کی گئی ہے جس سے مقصد عشق مجازی کی تاثیر ظاہر کرنا ہے۔ لکھا ہے کہ جب شیر شاہ سے شکست کھا کر منگل ہندوستان سے بھاگے اور جو بھاگنے میں ناکام رہے وہ گرفتار کر لیے گئے۔ بیرم خاں مالوہ سے شیر شاہ کی قید سے بھاگ کر گجرات پہنچا جہاں پر شیخ گدائی نے اس کی مدد کی۔ گجرات میں اپنے زمانہ قیام میں بیرم خاں کو خوبصورت مقامات کی سیر کی خواہش ہوئی۔ ایک جگہ اُس نے خواہش کو پانی بھرتے ہونے دیکھا۔ نزدیک ہی ایک درویش بیٹھا ملا۔ اچانک درویش کی نظر ایک مہندو دوشیزہ پر پڑی۔ اُس کے حسن و جمال سے ایسا متاثر ہوا کہ پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ درویش دوشیزہ کے قدموں پر گر پڑا اور ہاتھ منہ کی طرف لاکر فریاد کرنے لگا: پانی! پانی! لڑکی نے ہر چند ڈول سے اُس کے ہاتھوں پر پانی ڈالا لیکن پانی زمین پر گرتا رہا کیونکہ وہ پانی پینے کی بجائے اپنی نگاہ دوشیزہ کے چہرے پر جاتے ہوئے تھا۔ لیکن فریاد ”پانی! پانی“ برابر کر رہا تھا۔ آخر کار لڑکی ناراض ہو کر گھر چلی گئی۔ درویش بھوکا پیاسا کنویں کے پاس پڑا رہا۔ جب لڑکی آتی تھی تو وہ اس کا دیدار کرتا۔ جب درویش کے عشق کا چرچا ہونے لگا تو لڑکی نے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ ہجر کے نتیجے میں درویش چند دن میں جاں بحق ہو گیا۔ درویش کی موت کے بعد دوشیزہ کے دل پر اثر ہوا لہذا وہ اس کی قبر پر آکر کھلا و دیتی تھی۔ بیرم خاں تصوف سے دلچسپی رکھتا تھا اور عشق مجازی کی تاثیر کا بھی قائل تھا۔ اس نے اس قصہ کو نظم ہی نہیں کیا بلکہ تعلقین اور عبرت کے لیے اکثر اس کا ذکر بھی کرتا تھا۔

شیخ گدائی جو کہ شیخ جمالی کنیو کے بیٹے اور سہروردی سلسلہ میں باب کے خلیفہ بھی تھے۔ امراء میں بھی اُن کے مریدوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ اگر کے تحت نشین

ہونے پر گجرات سے آگرہ آگئے اور سیرم خاں کے توسط سے صدر کا عہدہ حاصل کیا۔
 شیخ گدائی ہندوی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ سلطہ عشق مجازی کے بھی قائل تھے
 غالباً اسی عشق کے اثر سے حسن پسند تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنے قارئین کی عبرت
 کے لیے لکھتے ہیں: باوجود کبر سن درلبا تین بہشت آئیں باماہر و بیان نازین گزرا نید و
 چوں نوبت مرگ رسید ہمہ را گزاشت۔ افسوس ہے کہ ہمارے کسی ماخذ میں ان کا ہندوی
 کا کوئی شعر نہیں ملا۔ ملاقا طعی نے اپنے تذکرہ میں چند فارسی کے اشعار نمونے کے طور
 پر دیئے ہیں۔

دراصل پندرہویں صدی میں ہندوستان میں ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود
 کی عام مقبولیت کی وجہ سے بہت سے نئے تصورات کے ساتھ عشق مجازی کو بھی اہمیت
 دی جاتی تھی۔ کچھ سنجیدہ اور عالم صوفی بھی عشق مجازی کو عشق حقیقی کے لیے ضروری سمجھنے
 لگے تھے۔ مثلاً سید محمد گیسو دراز جو ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود کو غیر اسلامی اور گمراہ کن
 تصور کرتے تھے عشق مجازی کی برکت اور تاثیر کے قائل تھے جیسا کہ ان کے مختلف
 ملفوظات سے ظاہر ہوتا ہے۔ سولہویں صدی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے چچا
 شیخ رزق اللہ مشتاقی اور ان کے چھوٹے بھائی اور محدث صاحب کے والد شیخ
 سیف الدین دہلی کے جید علماء میں شمار ہوتے تھے لیکن صوفی منش ہونے کی وجہ سے عشق
 مجازی کے قائل تھے۔ شیخ رزق اللہ مشتاقی شاعر بھی تھے۔ محدث صاحب کے مطابق
 ان کا فارسی اور ہندوی کلام اپنے درد اور سوز و گداز کی وجہ سے دہلی کے اشراف میں بہت
 پسند کیا جاتا تھا۔ ہندوی میں ان کا تخلص راجن تھا اور فارسی میں مشتاقی۔ ہندوی دیوان کے
 علاوہ انھوں نے تصوف پر ہندوی میں رسالے بھی لکھے تھے۔ ان رسالوں میں ”پیمان“
 اور جوت نرنجن خاص اہمیت کے حامل تھے۔ ان کی وفات ۹۸۹ھ میں ہوئی تھی۔ رزق اللہ
 مشتاقی کے ایک ہم عصر صوفی شاعر شیخ برہان الدین۔ ساکن کاپلی تھے۔ ان کے ہندوی

۱۔ اخبار الاخیار ص ۲۲۹ ۲۔ مجمع الشعراء جہا نیا شامی ص ۷۲

۳۔ ملاحظہ کیجئے جوامع الکلم ص ۱۱

۴۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار۔ دہلی ۱۳۲۲ھ ص ۱۴۴

دوہے بہت مقبول ہوئے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کا ہندوی کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ اگر شیخ رزق اللہ مشتاقی ہی کے رسالے اور شاعرانہ کلام دستیاب ہو جاتے تو دہلی میں بولی جانے والی زبان یعنی دہلوی پراچھی روشنی پڑ سکتی تھی۔

صوفیاء کرام کے ہندوی میں شعر کہنے اور تصوف پر رسالے لکھنے کی تصدیق ملک محمد جالٹی کے بیان سے بھی ہوتی ہے: "ہر یکے از اولیاء بدین لسان تکلم می فرمودند تا کہ ہند خلافت ایشاں با محقق و مدقق رسید وی درین زبان بسیاری از رسائل و ملفوظات فرمودہ"۔
 لو دیوں کے عہد کی بھلکتی تحریک کے رہنماؤں میں صرف کبیر اور نانک کے کلام کے نمونے دستیاب ہیں اور صوفی شعرا میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے دوہے اور اشعار شذنامہ میں ملتے ہیں۔ شذنامہ کو شیخ کے بیٹے شیخ رکن الدین نے مرتب کیا تھا۔ ایک دوسرے غیر معروف بزرگ شیخ عیسیٰ موانی (افغان) کے ہندوی اشعار نعمت اللہ ہروی کی تالیف تاریخ خان جہانی میں ملتے ہیں۔ ہروی لکھتے ہیں کہ عیسیٰ موانی نے تصوف پر فارسی، پشتو اور ہندوی میں علیحدہ علیحدہ رسالے لکھے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اُن کے فارسی اشعار کے ساتھ ہندوی اشعار نقل کئے ہیں:

کلمی ازنی جو گیا لکھ	اس کارن کبھی اتادو کھ
گہر بیچی دہ دسی دام	جو لکھیو تیسری نام
جو تو کرسی اللہ یقین	کامل ہو سی تیرا دین

ہند رہیں صدی کے ایک بزرگ شیخ عبدالحق صابری ردولوی کی ملفوظات میں بھی جو کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی مرتب کی ہوئی ہے بہت سے ہندوی الفاظ اور جملے ملتے ہیں۔ مثلاً "یک جھنگا چار پانی یافتند" اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اشعار کے گھروں میں مہذب عورتیں ہندوی میں بات چیت کرتی تھیں۔ مثلاً شیخ ایک کو تو ال کے یہاں قیام کرتے تو کو تو ال کی ماں فجر کے وقت اُن کو ان الفاظ میں

۱۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخبار - دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۲۸۱

۲۔ نعمت اللہ ہروی، تاریخ خان جہانی - مرتبہ محمد امام الدین - جلد دوم، ڈھاکہ

۱۹۶۲ء ص ۸۲۵ -

مخاطب کرتی ہے ”بیٹیا پانی گرم ہے“ یا پھر بھائی اور بھائی کے الفاظ استعمال ہونے لگے تھے۔ اسی عہد میں گجرات کے صوفیاء بھی ہندوی ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ وہاں کے سہروردی سلسلے کے مشہور بزرگ قطب عالم سید برہان الدین کے متفق ہے کہ ایک شب جب وہ تہجد کی نماز کے وقت وضو اور استنجا کے لیے باہر تشریف لائے تو اچانک ان کا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ سخت چوٹ لگنے پر وہ بے ساختہ بولے: ”لوہہ ہے یا لکڑی یا پتھر ہے۔ یا کیا ہے۔“

گجرات ہی کے دوسرے عالم بزرگ شیخ وحیدہ الدین گجراتی کی ملفوظات میں بھی ان کے بولے ہوئے ہندوی کے جملے اور الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ ان سے بھی گجراتی ہندوی اور دہلوی بولی میں مماثلت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر شیخ نے ایک عقیدت مند محمد صالح سے پوچھا کہ کیا وہ شراب پیتا ہے۔ جب اُس نے اثبات میں جواب دیا تو شیخ نے فرمایا: ”ولیوں کیا صفقات ہوتی ہیں؟“ (یعنی کیا ولیوں میں یہ صفت ہوتی ہے) ایک دن کسی شخص نے کہا کہ شیخ فضل اللہ نے درس و تدریس کا کام بند کر دیا ہے۔ اس پر شیخ نے کہا: ”جب ترقی کریں گے آپن درس کہیں گے۔“ ایک شخص نے بتایا کہ شیخ کا فلاں مرید فلاں کام میں الجھ گیا۔ جواب میں کہا: ”سب جھوڑ بیٹھے تو شتاب قائم ہو جاوے گا۔“ ایک دوسرے مرید کسی ایسے کام میں لگ گئے جو شیخ کو نا پسند تھا لہذا جب مرید سے ملاقات ہوئی تو اس سے فرمایا: ”میاں صغۃ اللہ جھوڑ دے۔“ ایک مرتبہ کہیں سے گزر ہوا اور راستہ میں ایک شخص ملا۔ اس سے پوچھنے لگے ”تمہیں اینہا رہتے ہو۔“ ایک مرید نے مجاہدہ اور ریاضت کرنے کی اجازت چاہی تو اس سے فرمایا: ”تمہاری بلاریاضت کرے۔“ ایک دن ایک شخص سے کہا: ”نا قابل کہیں کا برائے زرشلا میں ہو رہا ہے۔“ کسی نے کسی شخص کے بارے میں کہا کہ وہ فلاں چیز قبول نہیں کرے گا۔ شیخ نے جواب میں کہا: ”آپیں جھک کر قبول کرے گا۔“ ایک دن شیخ علی متقی کے متعلق تعریفاً کہا: شیخ علی کا تقویٰ کہاں، میرا مکان (یعنی مقام) کہاں، ایک دن ایک مرید کو بتایا کہ اگر

۱۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی، انوار العیون، ص ۱۲، ۲۱، ۲۰ وغیرہ

۲۔ سکندر بن منجمہ، مرآة سکندری، بمبئی، ص ۲۵۵

وہ فلاں کام کر بیٹھا تو اس کا "تقویٰ جھوٹ جاتا" ^۱

لودی سلاطین کے بعد شیر شاہ سورا اور اس کے جانشینوں نے بھی فارسی شعرا اور ادبا کے ساتھ ہندوی زبان کے شعرا کی بھی قدر دانی کی۔ اس عہد کے کچھ امرا بھی ہندوی میں معیاری شعر کہتے تھے اور ان کی سرپرستی میں نامور ہندوی کے شعرا رہتے تھے۔ شیر شاہ سورا اور اسلام شاہ سور کے ممتاز امرا میں شاہ محمد مزملی ہندوی کا نامور شاعر تھا۔ شیخ رزق اللہ مشتاقی اور شیخ کبیر بنی نے اس کی علم دوستی کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ شیخ کبیر شاہ محمد مزملی کی مجلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کے حلقہ احباب میں جنکی وہ سرپرستی کرتا تھا میرٹھن مصنف مدروالٹی اور سورداس شامل تھے۔ شاہ محمد مزملی کا چھوٹا بھائی میاں محسن مزملی بھی ہندوی میں شعر کہتا تھا۔ دونوں شاعر مہانوں کی تواضع میں بڑی فراخ دلی دکھاتے تھے۔ "دران کو شکہما پان وغالیہ ہر قسم ہنارہ بودند و آجاہ بمثل میر سید ٹھن مصنف مدروالٹی و شاہ محمد مزملی و محسن برادر خور دشاہ محمد (مزملی) و سورداس وغیرہ علماء و فضلا، دران کو شکہما بودند و شعرا عربی و پارسی و ہندوی می گفتند" ^۲

باوجودیکہ شاہ محمد مزملی فارسی اور عربی کے عالم تھے لیکن ان کا ہندوی کلام اس قدر معیاری تھا کہ مرزا کامران جیسا سخن فہم اور نکتہ سیخ بھی خراج تحسین دے بغیر نہ رہ سکا۔ جب مرزا کامران ہمایوں سے شکست کھا کر ہندوستان میں اسلام شاہ سور کے پاس پناہ کے لیے آیا تو اسلام شاہ نے اس کی دیکھ بھال کے لیے نہایت شائستہ امرا کا تعین کیا۔ ان امرا میں شاہ محمد مزملی بھی شامل تھے۔ ایک دن شاہ محمد مزملی کا کلام سن کر مرزا کامران نے کہا: بمثل شما اہل فضل و دانش اگر در پارسی شعر گفتی پس در عالم نشانی ہاندی" شاہ محمد مزملی نے جواب میں کہا تھا کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ہندوی میں شعر کہتا تھا کیونکہ اس کا محبوب فارسی سے نابلد تھا۔ "بواسطہ او در زبان ہندوی

^۱ شیخ محمد ملفوظات شیخ وصیہ الدین گجراتی، حبیب گنج کلکشن، فارسی مخطوط نمبر ۲۱/۲۲، ورق ۱۲ الف

۹ الف ۷۱ ب ۸۶ الف ۱۱ الف ۱۱۲ الف ۱۰ ب ۱۳ ب ۹ ب ۱۳۴ ب وغیرہ۔

^۲ شیخ کبیر بنی - افسانہ شاہانہ ہند۔ مخطوط برٹش لائبریری، لندن، ورق ۱۵۰۔

درد خود اظہار کر دیم۔ مرزا کا مران کو جواب پسند آیا اور اس نے خوب تعریف کی۔ شاہ محمد مزملی کے صرف دو مصرعے ملتے ہیں جو کہ مختلف ہیں

(۱) جم جم النکن ترت بلم ہر دین بہات

(۲) تم ہو کہ جل روپ ہوئے نین نگ

سور حکمرانوں کے عہد کے بعد جب مغلوں کے دور کا آغاز ہوا تو نئے حکمران طبقہ کی جانب سے جس کی مادری زبان فارسی تھی اور جو فارسی ادب کی روایات کا وارث تھا، فارسی شعر و ادب کی سرپرستی اور ہندوی سے بے اعتنائی کا ہونا بڑی حد تک فطری تھا اس کے نتیجے میں سولہویں صدی کے نصف آخر اور سترھویں صدی میں فارسی زبان میں نہایت میاری شعری اور نثری شاہکار وجود میں آئے۔ ابو الفضل کی نشر مغل عہد کے دانشوروں کے لیے ایک نمونہ بن گئی جس کا اتباع کرنا بھی علم و ادب کی دنیا میں ایک بڑا کارنامہ تصور کیا جانے لگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت تک ہندوی شاعری ہندی مسلمانوں کے کچھ کا حصہ ہو چکی اور یہ کلچرل روایت حکومت کی سرپرستی کی عدم موجودگی میں بھی زندہ رہی۔ اگر اور جہاں کے عہد کے نامور امیر عبدالرحیم خان خاناں کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی ملازمت یا سرپرستی میں فارسی شعرا اور ادبا کے ساتھ ہندی اور ہندوی کے شعرا بھی شامل تھے کہا جاتا ہے کہ خان خاناں خود بھی ہندی میں دوہے کہتا تھا۔ برخلاف شمالی ہندوستان کے دکن میں دکنی اردو برابر ترقی کے منازل طے کرتی رہی وہاں بیجاپور کے عادل شاہی اور گولکنڈہ کے قطب شاہی سلاطین دکنی اردو شعر و ادب کے دلدادہ رہے۔ دراصل شمالی ہندوستان میں ہندوی شعر و شاعری کا نشاۃ ثانیہ اٹھارہویں صدی کے آغاز سے ہوا اس زمانہ میں شاہی دربار اور دانشوروں میں اس کو سرپرستی ملی حضرت مظہر جان جاناں اور ان کے ہم عصر شعرا نے ہندوی زبان کی اصلاح کی اور جلد ہی اس کی نئی شکل ابھری جو کہ اردو کہلانے لگی۔

لہ رزق اللہ مشتاقی، واقعات مشتاقی۔ مخطوطہ برٹش لائبریری، لندن۔ ورق ۸۱ ب۔
لہ ملاحظہ کیجئے ایس اے حلیم کا انگریزی مقالہ:

Development of Hindi literature during Akber's Reign

India Quarters, Aligarh, vol III, Nos. 1-2, July-October

1967 pp. 88-99

جہاں تک اردو نثر کی ابتدا اور ترقی کا مسئلہ ہے اس کی باقاعدہ تاریخ اٹھارویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ ترقی بڑی حد تک زمین منت ہے گلکٹہ کالج میں اس زبان کے انگریزوں کی دلچسپی اور کاوش کا حکومت کے مفاد کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں افسران اعلیٰ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہندوستانی رعایا سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کے لیے انگریز عہدے داروں کو فارسی رسم الخط میں عام ہندوستانی زبان سکھانی جائے اس غرض سے انھوں نے فارسی کی کلاسیکی کتابوں کا آسان ہندوی میں ترجمہ کرانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں میرامن کی باغ و بہار (یعنی قصہ چہار درویش کا ترجمہ) اور مظہر علی خاں عباس سرودانی کی تحفہ اکبر شاہی یا تاریخ مشیر شاہی کا ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۰۰ء میں مرہٹوں کی شکست کے بعد انگریزوں کا مغل بادشاہ شاہ عالم سے معاہدہ اور اس کے تحت دہلی اور اس کے متعلقہ علاقہ میں انگریزی عہداری شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنری (یعنی مبلغین) بھی وارد ہوئے انھوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بائبل اور اپنے مذہبی لٹریچر کا آسان ہندوی میں ترجمہ کر کے تقسیم کرنا شروع کیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے نیا چیلنج تھا۔ لہذا شاہ عبدالعزیز کی ترغیب پر قرآن شریف کا عام بول چال کی زبان میں ترجمہ کیا جو مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ یہ ترجمہ اردو زبان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے بعد اسلام پر ہندوی میں متعدد اور مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی جانے لگیں اور جلد ہی یہ زبان اہم اسلامی زبانوں میں شامل ہو گئی۔ دوسری اہم کتاب شاہ اسماعیل شہید کی تصنیف تقویت الایمان ہے۔ دونوں کاموں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک بار بار شائع ہو رہی ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاہ عبدالقادر شاہ محمد اسماعیل اور سید احمد شہید بریلوی کے رفقا و اپنی تصنیفات کی زبان کو ہندی (ہندوی) کا نام دیتے ہیں۔ ان کے پیرووں کا لکھا ہوا لٹریچر اصلاحی اور تبلیغی نوعیت کا ہے۔ کتابوں کی تعداد کافی ہے۔ اس لٹریچر کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ میاری تصنیفات آتی ہیں جو کہ شاہ محمد اسماعیل اور سید احمد شہید بریلوی کے عالم رفقا و کار کے قلم سے ہیں۔ یہ مسلم خواص کے لیے لکھی گئی تھیں دوسرا وہ حصہ ہے نظم و نثر میں جو کہ سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے

متعلق لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے پہلے اور بعد میں مسلم عوام کی ذہنی اصلاح کے لیے لکھا تھا۔ اس لٹریچر کے مصنفین مختلف مقامات کا سفر بھی کرتے تھے اور وعظ و پند کے ذریعہ مسلمانوں میں غیر اسلامی رسومات اور دوسرے اثرات ختم کرنے کی جہد و جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس لٹریچر کی خصوصیت ہے کہ اس میں ذہنی مسائل کو آسان ترین زبان میں پیش کیا گیا ہے اور اس کا مطالعہ ذہن کے بجائے جذبات کو متاثر کرتا ہے۔ شاہ محمد اسماعیل کی تقویت الایمان کے بعد مولانا حرم علی کی تصنیف ”نصیحت المسلمین“ مولانا حسن قنوجی کی تصنیف ”ہدایت المؤمنین و سوالات عشرہ المحرم“ اور مولانا کرامت علی جونپوری کی ”حجت القاطع“ میاری کتابیں ہیں ان کا زمانہ طباعت ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۸ء ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے ان کے ایڈیشن لاہور، دہلی اور کلکتہ سے چھپتے رہے۔

اس لٹریچر کے سلسلے میں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ تاریخ ہند اور اردو ادب کے محققین نے اس لٹریچر کو وہابی ادب کا نام دیا ہے جو کہ ایک تاریخی غلطی ہے۔ کیونکہ اس لٹریچر کے مصنفین کا تعلق شاہ عبدالعزیز دہلوی کے توسط سے شاہ ولی اللہ کی تحریک سے تھا اور ان افراد میں عرب کی وہابی تحریک کے بجائے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا اثر تھا لہذا ان کی تحریک کو شاہ ولی الہی تحریک کے نام سے موسوم کرنا چاہیے اور لٹریچر کو بھی شاہ ولی الہی تحریک کا لٹریچر کہنا مناسب ہوگا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوی ہی اردو کہلائی جاستے لگی۔ اگرچہ جدید نشر کی تاریخ کی ابتدا کلکتہ کالج کے اردو ترجموں اور شاہ عبدالقادر کے قرآن شریف کے ترجمہ سے ہوتی ہے لیکن اس کو جدید ترین بنانے کا سہرا سرسید اور ان کے رفقاء کار کے سر ہے۔ سرسید کی تصنیفات عہد آفرین تھیں۔ ان کی قرآن شریف کی تفسیر نے اردو میں علم الکلام

سے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ”اردو میں وہابی ادب“ تحقیق کے اعلیٰ معیار پر اترتی ہے۔ انھوں نے برٹش لائبریری لندن اور انڈیا آفس لائبریری میں ہمہ مخطوطات کو دریافت کیا اور ان کا تجزیہ پیش کر کے ثابت کیا کہ اردو زبان کی ترقی میں اس لٹریچر کی کیا اہمیت ہے۔ اچھا ہوتا کہ وہ کتاب کا عنوان ”اردو میں شاہ ولی الہی تحریک کا ادب رکھتے۔ فاروقی صاحب کی کتاب دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی مطبوعات میں شامل ہے۔

کا آغاز کیا مولانا شبلی نعمانی اگرچہ اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے سرسید کے دینی افکار سے اختلاف رکھتے تھے اور انھوں نے قدیم مسلم متکلمین کے علمی کارناموں کو نمایاں کرنے کے لیے علم الکلام پر معیاری کام کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی تحریک انہیں سرسید ہی کے کام سے ملی تھی ان کے بعد سرسید کے افکار اور روایت سے مولانا آزاد اور مولانا مودودی بھی متاثر ہوئے۔ آخر الذکر نے شبلی نعمانی کے برعکس سرسید کی روشنی میں بدلے ہوئے زمانہ اور حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کی تفسیر اور ترجمانی کی ہے۔ سرسید کا تاریخ سے متعلق کام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ علم الکلام کی طرح علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ کا بھی جدید تصورات اور اسالیب کے تحت مطالعہ کیا جائے۔ اس ضمن میں ان کے افکار قدیم مسلم مورخین کے افکار سے مختلف تھے اس کے لیے علاحدہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کی تازہ پیش کش مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک اہم کتاب

اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور

خدمتِ خلق کا صحیح تصور غلط تصورات کی تردید۔ خدمتِ خلق کا اجر و ثواب۔ خدمت کے مستحقین۔ وقتی خدمات۔ رہنمائی خدمات۔ خدمت کے لیے انفرادی اور اجتماعی جدوجہد۔ موجودہ دور کے تقاضے مصنف کے جاندار قلم نے ان تمام گوشوں کو نکھار دیا ہے۔

ایک اہم موضوع پر اردو میں پہلی مستند کتاب، ہر فرد اور ہر ادارہ کے لیے یکساں مفید، آفسٹ کی حسین طباعت، خوبصورت سرورق، ضخامت ۷۶ صفحات
قیمت صرف ۲۵ روپے

ملنے کے پتے

ادارہ تحقیق۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ
مرکزی مکتبہ اسلامی۔ بازار چٹلی قنبر۔ دہلی۔